ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 405

Program: B.A

Semester: Autumn 2026

WhatsApp Orders: +92 324 5836626

ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY, ISLAMABAD

Course: Iqbaliyat (405) • Level: B.A.

Semester: Autumn 2026

Assignment No. 1 (Units 1–5)

SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

(For Study & Reference)

Note: This guide is prepared for study and reference purposes. Students are advised to read the relevant units of the course book, understand the ideas, and then write the assignment in their own words. Direct copying is discouraged.

کورس :اقبالیات — (405) سطح :بی اے — سمسٹر :خزاں — 2026 امتحانی مشق نمبر) 1 یونٹ 1 تا — (5 کل نمبر100 :، کامیابی کے نمبر40 :

سوال نمبر :1 مختصر سوالات کے جوابات) سوانح و حالاتِ اقبال 20) (نمبر(

سوال نمبر :1 درج ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کریں۔ (1) علامہ اقبال نے کون سے دو مدارس میں ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی؟ (2) علامہ اقبال کے والدین کہاں سے ہجرت کر کے آئے تھے؟ (3) علامہ اقبال کے بیٹوں کے کیا نام ہیں؟ (4) علامہ اقبال یورپ سے واپس کب آئے؟ (5) علامہ اقبال کی پہلی نثری تصنیف کا کیا نام ہے؟ (6) علامہ اقبال کو سر کا خطاب کب ملا؟ (7) علامہ اقبال کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا کیا عنوان تھا؟ (8) اقبال کی والدہ کب فوت ہوئیں؟ (9) اقبال نے پرائمری جماعت کا امتحان کس مشہور استاد کی راہنمائی میں پاس کیا تھا؟ (10) شعر مکمل کریں :کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا۔(2x10=20)

تمہید و تعارف

علامہ محمد اقبال(1877) ء تا1938 ء (کی زندگی اور شخصیت کا مطالعہ اقبالیات کے اس کورس کی بنیاد ہے، کیونکہ اقبال کی شاعری اور فکر کو سمجھنے کے لیے ان کے سوانحی پس منظر سے واقفیت ناگزیر ہے۔ اقبال 9 نومبر1877 ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ نور محمد ایک نیک سیرت اور صوفی مزاج بزرگ تھے اور والدہ امام بی بی بھی نہایت پرہیزگار خاتون تھیں۔ یہ دس مختصر سوالات اقبال کی ابتدائی تعلیم، خاندانی پس منظر، یورپ کے قیام، تصانیف اور اعزازات سے متعلق بنیادی معلومات کا جائزہ لیتے ہیں۔ ذیل میں ہر سوال کا جواب الگ عنوان کے تحت ترتیب وار

پیش کیا جا رہا ہے تاکہ طالب علم امتحانی ضرورت کے مطابق ہر نکتہ کو آسانی سے یاد کر سکے اور اپنے الفاظ میں لکھ سکے۔

(1)ابتدائی تعلیم کے دو مدارس

علامہ اقبال نے ابتدائی تعلیم سیالکوٹ ہی میں حاصل کی۔ چار برس کی عمر میں انہیں محلے کی مسجد کے مکتب میں قرآن مجید کی تعلیم کے لیے بٹھایا گیا۔ ان دو مدارس کے نام جن میں اقبال نے باقاعدہ ابتدائی تعلیم حاصل کی، یہ ہیں :)الف (مولوی سید میر حسن کا مدرسہ، جہاں پانچ برس کی عمر میں اقبال داخل ہوئے اور عربی، فارسی اور اردو ادب کی بنیادی تعلیم اس عظیم استاد سے پائی؛) ب (اسکاچ مشن ہائی اسکول سیالکوٹ، جس میں مولوی میر حسن ہی کی ترغیب پر داخلہ لیا گیا، کیونکہ میر حسن وہاں عربی کے استاد بھی تھے۔ اسی اسکول سے اقبال نے1891 ء میں مڈل اور1893 ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا، اور پھر اسکاچ مشن کالج سے1895 ء میں انٹرمیڈیٹ) ایف اے (کی سند حاصل کی۔

(2)والدین کی ہجرت

علامہ اقبال کے والدین کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ آئے تھے۔ اقبال کا خاندان اصلاً کشمیر کے سپرو برہمن گھرانے سے تعلق رکھتا تھا، جس نے چند نسلیں پہلے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اقبال کے پردادا کے زمانے میں یہ خاندان کشمیر کی سیاسی ابتری اور سکھ دور کے حالات کے باعث وادی سے ہجرت کر کے پنجاب کے شہر سیالکوٹ میں آباد ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اپنے آپ کو کشمیری النسل کہتے تھے اور ایک مشہور شعر میں بھی انہوں نے اپنی کشمیری اصل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کشمیری مزاج کی نرمی، فطرت پسندی اور علمی ذوق اقبال کی شخصیت میں نمایاں نظر آتا ہے، جس کی جڑیں اسی خاندانی پس منظر میں پیوست ہیں۔

(3)اقبال کے بیٹوں کے نام

علامہ اقبال کے دو بیٹے تھے :آفتاب اقبال اور جاوید اقبال۔ آفتاب اقبال اقبال کی پہلی اہلیہ کریم بی بی سے تھے، جو بعد میں بیرسٹر بنے اور کراچی میں مقیم رہے۔ جاوید اقبال دوسری اہلیہ سردار بیگم سے تھے، جو 13 اکتوبر1924 ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ جاوید اقبال نے قانون کی تعلیم حاصل کی، لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور بعد ازاں سپریم کورٹ کے جج کے عہدے تک پہنچے، سینیٹر بھی رہے اور اپنے والد کے افکار کی تشریح و ترویج میں بھرپور حصہ لیا۔ اقبال کی ایک

بیٹی میراج بیگم بھی تھیں جو کم سنی میں وفات پا گئیں۔ اقبال نے اپنی مشہور نظم جاوید کے نام اپنے چھوٹے بیٹے جاوید اقبال کو مخاطب کر کے لکھی، جو درحقیقت تمام نوجوانانِ ملت کے نام ان کا پیغام ہے۔

(4)یورپ سے واپسی

علامہ اقبال یورپ سے1908 ء میں واپس آئے۔ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے1905 ء میں یورپ روانہ ہوئے تھے۔ تین برس کے اس قیام میں انہوں نے انگلستان کی کیمبرج یونیورسٹی کے ٹرنٹی کالج سے فلسفے کی تعلیم حاصل کی، لنکنز ان سے بیرسٹری کی سند پائی، اور جرمنی کی میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اگست1908 ء میں وہ لاہور واپس پہنچے۔ یورپ کا یہ قیام اقبال کی فکری زندگی کا فیصلہ کن موڑ تھا۔ مغربی تہذیب کے قریبی مشاہدے نے انہیں اس کے مادی حسن اور فکری کھوکھلے پن دونوں سے آگاہ کیا اور انہی تجربات نے بعد میں ان کی شاعری کو احیائے ملت کا عالمی پیغام عطا کیا۔ واپسی پر انہوں نے وکالت کو ذریعہ معاش بنایا اور گورنمنٹ کالج لاہور میں کچھ عرصہ تدریس سے بھی منسلک رہے۔

(5)پہلی نثری تصنیف

علامہ اقبال کی پہلی نثری تصنیف علم الاقتصاد ہے، جو1903 ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور میں تدریس کے دوران لکھی اور اسے اردو زبان میں معاشیات پر لکھی جانے والی اولین کتب میں شمار کیا جاتا ہے، بلکہ بیشتر محققین اسے اردو کی پہلی باقاعدہ معاشیات کی کتاب قرار دیتے ہیں۔ اس کتاب میں اقبال نے معاشی اصولوں، دولت کی تقسیم، آبادی اور محنت جیسے موضوعات کو سادہ اور سلیس اردو میں بیان کیا۔ علم الاقتصاد اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں اقبال کے بعد کے فکری نظام کی اولین جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں، خصوصاً قوم کی معاشی خودمختاری اور خود انحصاری پر ان کا زور، جو ان کی شاعری کے بنیادی افکار سے جڑا ہوا نظر آتا ہے۔

(6)سر کا خطاب

علامہ اقبال کو سر کا خطاب1923 ء میں ملا۔ برطانوی حکومت نے اقبال کی علمی، ادبی اور قومی خدمات کے اعتراف میں انہیں نائٹ ہڈ (Knighthood) کے اعزاز کے لیے منتخب کیا؛ یہ اعزاز سالِ نو1923 ء کی اعزازی فہرست میں شامل تھا، جس کے بعد وہ سر محمد اقبال کہلائے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اقبال نے یہ خطاب قبول تو کیا مگر اس پر کبھی فخر نہیں کیا۔ ان کا اصل اعزاز ان کی شاعری اور فکر ہے، جس کی بنا پر دنیا انہیں شاعرِ مشرق، حکیم الامت اور مصورِ

پاکستان کے خطابات سے یاد کرتی ہے۔ یہ بھی ایک دلچسپ تاریخی حقیقت ہے کہ اقبال کو خطاب ملنے کے وقت ان کے استاد مولوی سید میر حسن کو بھی شمس العلما کا خطاب دیا گیا، اور روایت ہے کہ اقبال نے اپنے استاد کے اعزاز کو اپنے اعزاز پر مقدم جانا۔

(7)پی ایچ ڈی مقالے کا عنوان

علامہ اقبال کے پی ایچ ڈی مقالے کا عنوان تھا The Development of Metaphysics in Persia: یعنی ایران میں مابعدالطبیعیات کا ارتقا۔ یہ مقالہ اقبال نے جرمنی کی میونخ یونیورسٹی میں پیش کیا اور1907 ء میں انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا ہوئی؛ مقالہ1908 ء میں لندن سے کتابی صورت میں شائع ہوا اور یورپ کے علمی حلقوں میں اس کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ اس مقالے میں اقبال نے زرتشت سے لے کر بہائی تحریک تک ایرانی فکر کے ارتقا کا تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ ان کا بنیادی موقف یہ تھا کہ ایرانی صوفیانہ فکر میں وحدت الوجود اور نفیِ خودی کے رجحانات نے ایرانی قوم کی عملی زندگی کو کمزور کیا۔ یہی تنقید بعد میں اسرارِ خودی میں ان کے فلسفہ خودی کی بنیاد بنی، اس لیے یہ مقالہ محض ایک تعلیمی سند نہیں بلکہ اقبال کے پورے نظامِ فکر کا نقطہ آغاز ہے۔

(8)والدہ کی وفات

اقبال کی والدہ امام بی بی 9 نومبر1914 ء کو فوت ہوئیں۔ یہ تاریخ خاص طور پر دل کو چھو لینے والی ہے کیونکہ 9 نومبر اقبال کی اپنی سالگرہ کا دن بھی ہے؛ یوں والدہ کا انتقال ان کے یومِ پیدائش پر ہوا۔ امام بی بی نہایت نیک، عبادت گزار اور سخی خاتون تھیں۔ اقبال کو اپنی والدہ سے غیر معمولی عقیدت و محبت تھی اور وہ کہا کرتے تھے کہ ان کی شخصیت کی تعمیر میں والدہ کی تربیت کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ والدہ کی وفات پر اقبال نے ایک پُرسوز مرثیہ بھی لکھا جو بانگِ درا میں والدہ مرحومہ کی یاد میں کے عنوان سے شامل ہے۔ اس نظم میں والدہ کی جدائی کا غم، قبر پر حاضری کا منظر اور زندگی کی بے ثباتی کا فلسفیانہ اظہار اس انداز سے ہوا ہے کہ یہ اردو کے بہترین مرثیوں میں شمار ہوتی ہے۔

(9)پرائمری امتحان اور مشہور استاد

اقبال نے پرائمری جماعت کا امتحان مولوی سید میر حسن کی راہنمائی میں پاس کیا تھا۔ مولوی سید میر حسن(1844 ء تا1929 ء (سیالکوٹ کے نامور عالم، عربی و فارسی کے استاد اور شمس العلما کے خطاب یافتہ بزرگ تھے۔ وہ اسکاچ مشن اسکول و کالج میں عربی پڑھاتے تھے اور شہر میں ان کا اپنا مدرسہ بھی چلتا تھا۔ اقبال کے والد شیخ نور محمد نے بیٹے کو

میر حسن کی شاگردی میں دیا اور یہی فیصلہ اقبال کی زندگی کا سنگِ میل ثابت ہوا۔ میر حسن نے نہ صرف اقبال کو عربی، فارسی اور اردو ادب کی مضبوط بنیاد فراہم کی بلکہ ان میں دینی ذوق، خودداری اور ادبی حس بھی پروان چڑھائی، اور انہی کی ترغیب پر اقبال مشاعروں میں شعر پڑھنے لگے۔ اقبال عمر بھر اپنے اس استاد کا بے حد احترام کرتے رہے اور انہیں اپنا روحانی مربی قرار دیتے تھے۔

(10)شعر کی تکمیل

مطلوبہ شعر کی تکمیل اس طرح ہے :کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا، نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں۔ یہ شعر اقبال کے مجموعے بالِ جبریل سے ہے اور اس میں اقبال کے فلسفہ خودی کا نچوڑ بیان ہوا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ مردِ مومن کی قوتِ بازو اور قوتِ ارادی کا اندازہ لگانا کسی کے بس کی بات نہیں، کیونکہ اس کی محض ایک نگاہِ ایمانی تقدیروں کے رخ بدل دیتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس انسان کی خودی عشقِ الٰہی اور یقین سے مضبوط ہو جائے، وہ حالات کا غلام نہیں رہتا بلکہ حالات کو اپنے ارادے کے تابع کر لیتا ہے۔ یہی پیغام اقبال کے اس دوسرے مشہور شعر سے بھی ملتا ہے کہ خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے، خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے۔ گویا اقبال کے نزدیک ایمان، یقین اور عمل انسان کو تقدیر کا محتاج نہیں بلکہ تقدیر ساز بنا دیتے ہیں۔

خلاصہ و نتیجہ

ان دس مختصر جوابات سے اقبال کی سوانح کے بنیادی خطوط واضح ہو جاتے ہیں :سیالکوٹ میں میر حسن جیسے استاد کی شاگردی، کشمیری خاندانی پس منظر، جاوید اور آفتاب جیسے صاحبِ علم بیٹے،1903 ء میں علم الاقتصاد سے نثر نگاری کا آغاز، میونخ سے پی ایچ ڈی،1908 ء میں وطن واپسی، والدہ کی وفات کا صدمہ اور1923 ء میں سر کا خطاب۔ یہ تمام واقعات مل کر اس فکری ارتقا کی کڑیاں بنتے ہیں جس نے اقبال کو محض ایک شاعر سے بڑھ کر ملت کا رہنما بنا دیا۔ امتحان میں ان سوالات کے جوابات لکھتے وقت تاریخوں اور ناموں کی درستی کا خاص خیال رکھنا چاہیے، کیونکہ مختصر سوالات میں نمبر اسی درستی پر ملتے ہیں۔

سوال نمبر :2 منتخب عنوانات پر نوٹ 20) نمبر(

سوال نمبر :2 مندرجہ ذیل عنوانات میں سے کسی دو پر نوٹ لکھیں۔) الف (اقبال کا زمانۂ طالب علمی) ب (اقبال اور مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن) ج (اقبال اور قائدِ اعظم کے روابط۔(20)

تمہید و تعارف

اس سوال میں تین عنوانات دیے گئے ہیں جن میں سے کسی دو پر نوٹ لکھنا مطلوب ہے۔ طالب علم کی سہولت کے لیے یہاں تینوں عنوانات پر جامع نوٹ پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ وہ اپنی پسند کے دو عنوانات منتخب کر کے امتحان میں لکھ سکے۔ پہلا عنوان اقبال کی طالب علمی کے دور سے متعلق ہے جو ان کی شخصیت سازی کی بنیاد ہے؛ دوسرا عنوان اقبال کے طلبہ سیاست اور نوجوانوں سے تعلق کو اجاگر کرتا ہے؛ اور تیسرا عنوان اقبال اور قائدِ اعظم محمد علی جناح کے تاریخی روابط کو بیان کرتا ہے، جنہی روابط نے برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی تقدیر بدل کر رکھ دی۔ ان تینوں موضوعات کا مطالعہ یہ سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ اقبال کی فکر کس طرح ذاتی محبت سے شروع ہو کر قومی بیداری اور آخرکار ایک الگ وطن کے تصور تک پہنچی۔

الف (اقبال کا زمانۂ طالب علمی)

اقبال کا زمانۂ طالب علمی محنت، ذہانت اور غیر معمولی قابلیت کی درخشاں مثال ہے۔ ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں مولوی سید میر حسن کی سرپرستی میں حاصل کرنے کے بعد اقبال نے اسکاچ مشن ہائی اسکول سے میٹرک اور اسکاچ مشن کالج سے ایف اے پاس کیا۔1895 ء میں وہ لاہور آ گئے اور گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا، جہاں سے1897 ء میں بی اے اور 1899ء میں فلسفے میں ایم اے کیا۔ ایم اے میں ان کی کارکردگی اتنی شاندار تھی کہ وہ یونیورسٹی میں نمایاں پوزیشن کے ساتھ ساتھ طلائی تمغے کے بھی مستحق قرار پائے۔ گورنمنٹ کالج میں پروفیسر آرنلڈ جیسے استاد کی رفاقت نے اقبال کے فکری ذوق کو نکھارا اور انہی کی سفارش پر اقبال بعد میں یورپ گئے۔ لاہور کے اس دور میں اقبال انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں اور مشاعروں میں شرکت کرنے لگے اور ان کی شاعری کی شہرت پھیلنے لگی۔

طالب علمی ہی کے زمانے میں اقبال کی ادبی زندگی کا باضابطہ آغاز ہو گیا تھا۔1901 ء میں شیخ عبدالقادر نے رسالہ مخزن جاری کیا تو اقبال کی اولین نظمیں اسی میں شائع ہوئیں، جن میں ہمالہ جیسی نظم نے انہیں ایک ابھرتے ہوئے شاعر کے طور پر متعارف کرایا۔ بی اے اور ایم اے کے بعد اقبال نے تدریس کا پیشہ اختیار کیا اور اورینٹل کالج اور

گورنمنٹ کالج لاہور میں لیکچرار رہے۔ اسی دوران ان کی کتاب علم الاقتصاد(1903) ء (شائع ہوئی۔1905 ء میں وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ روانہ ہوئے، جہاں کیمبرج سے فلسفے کی تعلیم، لنکنز ان سے بیرسٹری اور میونخ سے پی ایچ ڈی مکمل کر کے1908 ء میں واپس آئے۔ گویا اقبال کا زمانۂ طالب علمی تقریباً1908 ء تک پھیلا ہوا ہے اور اس سارے عرصے میں مسلسل اولیٰ پوزیشنیں، اساتذہ کی شفقت اور ادبی شہرت کا امتزاج ان کی آئندہ عظمت کی پیش گوئی کرتا نظر آتا ہے۔

ب) اقبال اور مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن

اقبال نوجوانوں کو ملت کا اصل سرمایہ سمجھتے تھے اور طلبہ کی منظم جدوجہد پر ان کا پختہ یقین تھا۔ مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن کا قیام1937 ء کے اواخر میں عمل میں آیا، جب قائدِ اعظم کی سرپرستی میں مسلم لیگ کی طلبہ تنظیم کے طور پر اس کی بنیاد رکھی گئی، تاکہ طلبہ کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے تحریکِ آزادی اور مسلم لیگ کے پیغام کو تعلیمی اداروں تک پہنچایا جا سکے۔ اقبال نے اس تنظیم سازی کی بھرپور حوصلہ افزائی کی، کیونکہ ان کی شاعری کا سب سے بڑا مخاطب ہی نوجوان طالب علم تھا۔ شاہین، نوجوان اور مردِ مومن کی علامتیں دراصل اسی طالب علم کے لیے وضع کی گئی تھیں جسے اقبال مستقبل کا معمار دیکھنا چاہتے تھے۔

اقبال طلبہ سے ہمیشہ یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ کردار، خودی اور ملی شعور سے بھی آراستہ ہوں۔ ان کی یہ فکر فیڈریشن کے مقاصد سے پوری طرح ہم آہنگ تھی، کیونکہ فیڈریشن کا مقصد بھی طلبہ کو محض سیاسی نعروں تک محدود رکھنا نہیں تھا بلکہ ان میں قیادت کی صلاحیت، دینی حمیت اور قومی خودداری پیدا کرنا تھا۔ اقبال کی زندگی کے آخری سالوں میں طلبہ وفود ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور وہ انہیں مطالعے، محنت اور اخلاص کا درس دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ فیڈریشن اور اس کے بعد قائم ہونے والی طلبہ تحریکوں نے اقبال کو اپنا فکری رہنما قرار دیا اور ان کا کلام ان تنظیموں کے جلسوں کی زینت بنا رہا۔ یوں اقبال اور مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن کا رشتہ ایک فکری و روحانی نسبت ہے جس نے طلبہ سیاست کو ایک مثبت مقصد عطا کیا۔

ج) اقبال اور قائدِ اعظم کے روابط

اقبال اور قائدِ اعظم محمد علی جناح کے روابط برصغیر کی تاریخ کے فیصلہ کن روابط میں سے ہیں۔ دونوں رہنماؤں کا تعلق باہمی احترام اور فکری ہم آہنگی پر قائم تھا۔1930 ء میں اقبال نے خطبہ الہ آباد میں مسلمانوں کے لیے ایک الگ ریاست کا تصور پیش کیا، اور یہی تصور بعد میں قائدِ اعظم کی قیادت میں پاکستان کی صورت میں حقیقت بنا۔1937 ء میں

صوبائی انتخابات کے بعد کے نازک دور میں اقبال نے قائدِ اعظم کو مسلسل خطوط لکھے جن میں پنجاب کی سیاست، مسلم لیگ کی تنظیم نو اور مسلمانوں کے آئینی مستقبل پر تفصیلی رہنمائی کی۔ یہ خطوط بعد میں Letters of Iqbal to Jinnah کے نام سے شائع ہوئے اور تحریکِ پاکستان کے بنیادی دستاویزات میں شمار ہوتے ہیں۔

قائدِ اعظم اقبال کو اپنا رہنما اور مرشد مانتے تھے۔ انہوں نے بارہا فرمایا کہ اقبال ان کے سب سے بڑے رہنما، فلسفی اور دوست تھے، اور یہ کہ اقبال کی زندگی میں مسلم لیگ کو ان کی رہنمائی حاصل رہی۔ روایت ہے کہ1930 ء کی دہائی میں جب قائدِ اعظم لندن میں خود ساختہ جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے تو اقبال جیسے رہنماؤں کی خواہش اور مسلمانانِ ہند کی ضرورت انہیں واپس لے آئی۔ اقبال کی وفات 21 اپریل 1938 ء کو ہوئی تو قائدِ اعظم نے گہرے رنج کا اظہار کرتے ہوئے انہیں اسلام کا عظیم خادم اور ملت کا محسن قرار دیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد قائدِ اعظم نے اقبال کو ہمیشہ مصورِ پاکستان کے طور پر خراجِ عقیدت پیش کیا۔ یوں یہ روابط محض دو شخصیات کی دوستی نہیں بلکہ ایک عظیم قومی مقصد میں فکر اور عمل کا حسین امتزاج تھے :اقبال نے خواب دیکھا اور جناح نے اسے تعبیر دی۔

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ اقبال کی طالب علمی کا دور محنت اور قابلیت کی بنیاد فراہم کرتا ہے، مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن سے ان کا فکری رشتہ نوجوان نسل کی تربیت کے ان کے مشن کو ظاہر کرتا ہے، اور قائدِ اعظم سے روابط اس مشن کی سیاسی تکمیل کی صورت ہیں۔ ان تینوں عنوانات کو ملا کر دیکھنے سے اقبال کی زندگی کا ایک مکمل نقشہ سامنے آتا ہے :ایک طالب علم سے فلسفی شاعر، فلسفی شاعر سے قوم کا رہنما، اور رہنما سے ایک نئی مملکت کا مصور۔ امتحان میں نوٹ لکھتے وقت ہر عنوان کے اہم واقعات اور تاریخیں نمایاں کرنی چاہئیں اور آخر میں اپنا تجزیہ بھی شامل کرنا چاہیے۔

سوال نمبر :3 اقبال کی سرگرمیاں1912 ء تا1918 ء اور اس دور کی کتب 20) نمبر(

سوال نمبر1912 :3 ء تا1918 ء اقبال کی سرگرمیوں کا جائزہ لیں نیز بتائیے کہ اس دور میں اقبال کی کون سی کتب شائع ہوئیں؟(20)

تمہید و تعارف

1912ء سے1918 ء تک کا دور اقبال کی زندگی کا نہایت اہم اور پُرثمر دور ہے۔ یہ وہی زمانہ ہے جب پہلی جنگِ عظیم 1914)ء تا1918 ء (نے دنیا کا نقشہ بدل دیا، سلطنتِ عثمانیہ اپنی آخری سانسیں گن رہی تھی اور برصغیر کے مسلمان شدید بے چینی کا شکار تھے۔ اقبال اس دور میں لاہور میں وکالت کی مشق کر رہے تھے، مگر ان کی اصل سرگرمی شاعری اور فکر کی دنیا میں تھی۔ یہی وہ دور ہے جب اقبال کی شاعری قومی و وطنی رنگ سے آگے بڑھ کر خالص ملی و اسلامی شاعری میں ڈھلی اور ان کا فلسفۂ خودی منظوم صورت میں دنیا کے سامنے آیا۔ ذیل میں اس دور کی سرگرمیوں کا سال بہ سال جائزہ اور شائع ہونے والی کتب کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

جدول :1 دورِ1912 ء تا1918 ء کے اہم واقعات و تصانیف

سال	واقعہ / تصنیف	اہمیت
1912ء	بلقان و طرابلس کی جنگوں پر ملی بیداری	شاعری میں ملی رنگ کا غلبہ
1913ء	جوابِ شکوہ	مسلمانوں کو عمل و جدوجہد کی تلقین
1914ء	جنگِ عظیم اول کا آغاز؛ والدہ کا انتقال	مرثیہ والدہ مرحومہ کی یاد میں
1915ء	اسرارِ خودی) فارسی مثنوی(	فلسفۂ خودی کا منظم اظہار
1918ء	رموزِ بے خودی) فارسی مثنوی(	فرد و ملت کے تعلق کی وضاحت

پس منظر اور عمومی سرگرمیاں

اس دور کے آغاز میں اقبال قانونی پیشے سے وابستہ تھے اور لاہور ہائی کورٹ میں وکالت کرتے تھے، تاہم وہ تدریس سے مکمل طور پر الگ ہو چکے تھے۔ ان کی شہرت اب محض ایک شاعر کی نہیں رہی تھی بلکہ مسلمانانِ ہند انہیں اپنا فکری رہنما سمجھنے لگے تھے۔1912 ء میں طرابلس و بلقان کی جنگوں نے عالمِ اسلام کو ہلا کر رکھ دیا تھا؛ اطالیہ نے طرابلس پر اور بلقانی ریاستوں نے سلطنتِ عثمانیہ پر حملے کیے تو ہندوستان کے مسلمانوں میں شدید غم و غصہ پھیل گیا۔ اقبال نے ان واقعات پر قلبی ردعمل کا اظہار اپنی نظموں اور تقاریر کی صورت میں کیا اور زخمی ترک مجاہدین کے لیے چندے کی اپیلوں میں بھی حصہ لیا۔ یہی سیاسی بیداری اس دور کی شاعری کا اصل محرک ہے۔

1913ء میں اقبال نے اپنی مشہور نظم جوابِ شکوہ لکھی، جو شکوہ1909) ء (کا جواب ہے۔ روایت کے مطابق یہ نظم لاہور میں موچی دروازے کے باہر ایک بڑے جلسے میں پڑھی گئی جس کا مقصد ترک زخمیوں کے لیے امداد جمع کرنا تھا۔

اس نظم میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کو ان کی کوتاہیوں پر ملامت اور پھر عمل و جدوجہد کی تلقین کی گئی ہے۔ اسی دور میں اقبال نے شمع اور شاعر جیسی نظم بھی انجمن حمایتِ اسلام کے جلسے میں پڑھی، جس میں ملت کی زبوں حالی اور امید کے پیغام کو یکجا کیا گیا۔ یوں اقبال کی شاعری اب محض ادبی تفریح نہیں رہی تھی بلکہ قوم کی نبض پر ہاتھ رکھنے والا ایک فکری و انقلابی اوزار بن چکی تھی۔

جنگِ عظیم اور ذاتی زندگی کے واقعات

1914ء میں پہلی جنگِ عظیم چھڑ گئی، جس میں سلطنتِ عثمانیہ جرمنی کی حلیف بن کر اتحادیوں کے خلاف میدان میں اتری۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے یہ سخت آزمائش کا وقت تھا، کیونکہ ایک طرف برطانوی حکومت کی وفاداری کا تقاضا تھا اور دوسری طرف خلیفۃ المسلمین سے عقیدت۔ اقبال اس کشمکش میں مسلمانوں کو ملی شعور اور صبر و حکمت کا درس دیتے رہے۔ اسی سال 9 نومبر1914ء کو ان کی والدہ امام بی بی کا انتقال ہوا، جو ان کے لیے شدید ذاتی صدمہ تھا۔ اس غم کا اظہار انہوں نے اپنے مشہور مرثیے والدہ مرحومہ کی یاد میں کیا۔ ذاتی غم اور قومی المیے کے اس امتزاج نے اقبال کی شاعری کو اور بھی گہرائی اور کائناتی وسعت عطا کی، اور ان کی نظموں میں زندگی و موت کے فلسفیانہ سوالات نمایاں ہونے لگے۔

جنگ کے برسوں میں اقبال نے کسی عملی سیاسی جماعت کی رکنیت اختیار نہیں کی، لیکن ان کی ہم دردی ہمیشہ مسلمانوں کے ملی مفادات کے ساتھ رہی۔ وہ اس عرصے میں اپنے فلسفے کی تدوین میں مصروف رہے۔ انہیں یقین ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کے زوال کا اصل سبب خودی کی کمزوری، تقدیر پرستی اور بے عملی ہے۔ اسی سوچ کے تحت انہوں نے فارسی زبان میں مثنوی لکھنے کا فیصلہ کیا تاکہ ان کا پیغام پورے عالمِ اسلام تک پہنچے، کیونکہ فارسی اس دور میں مسلم دنیا کی مشترکہ علمی و ادبی زبان تھی۔ اس دور کی سرگرمیوں میں علمی محافل میں شرکت، نوجوانوں کی رہنمائی اور اخبارات و رسائل میں نظموں کی اشاعت بھی شامل تھی۔1918ء میں جنگ ختم ہوئی اور سلطنتِ عثمانیہ کے بکھرنے کے ساتھ ساتھ اقبال کا پیغام مزید انقلابی صورت اختیار کر گیا، جس کا مکمل اظہار آنے والے برسوں میں ہوا۔

اس دور میں شائع ہونے والی کتب

اس دور1912) ء تا1918 ء (میں اقبال کی دو عظیم فارسی مثنویاں شائع ہوئیں، جو ان کے فکری نظام کی بنیاد ہیں۔ پہلی کتاب اسرارِ خودی ہے جو1915 ء میں شائع ہوئی۔ یہ فارسی مثنوی مولانا روم کی مثنوی کے بحر و انداز میں لکھی گئی

اور اس میں اقبال نے فلسفہِ خودی کو پہلی مرتبہ منظم صورت میں پیش کیا :انسان کی ذات یا خودی کی پہچان، اس کی پرورش اطاعت و ضبطِ نفس سے اور اس کی تکمیل نیابتِ الٰہی کے درجے تک، یہ اس کتاب کے بنیادی مراحل ہیں۔ اس کتاب نے اقبال کو عالمِ اسلام میں فلسفی شاعر کے طور پر متعارف کرایا اور بعد میں پروفیسر نکلسن نے اس کا انگریزی ترجمہ(1920 The Secrets of the Self ء (شائع کیا۔

دوسری کتاب رموزِ بے خودی ہے جو1918 ء میں شائع ہوئی۔ اگر اسرارِ خودی میں فرد کی خودی کی تعمیر کا پروگرام ہے تو رموزِ بے خودی میں اس فرد کو ملت میں ضم ہونے کا درس دیا گیا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ فرد کا اصل مقام ملت ہی سے وابستہ ہے، اور ملتِ اسلامیہ کی بنیاد توحید، رسالت اور کتابِ الٰہی پر ہے۔ اس مثنوی میں ملت کی تعمیر، اس کے ارکان اور مسلمان کے اجتماعی فرائض پر بحث کی گئی ہے۔ ان دونوں کتب کو ملا کر اقبال کے فلسفے کا مکمل نظام بنتا ہے :خودی فرد کو مضبوط کرتی ہے اور بے خودی اسے ملت کی خدمت میں فنا کر کے بقا عطا کرتی ہے۔ اشاعت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس دور کی یہ دو کتب ہی اصل کارنامہ ہیں، کیونکہ اردو مجموعہ بانگِ درا ابھی1924 ء میں آ کر شائع ہوا، جس میں اس دور کی منتخب اردو نظمیں بھی شامل ہوئیں۔

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

خلاصہ و نتیجہ

مجموعی جائزہ یہ ہے کہ1912 ء تا1918 ء کا دور اقبال کی فکری پختگی کا دور ہے۔ وکالت کی مصروفیات کے باوجود ان کی اصل توانائی ملت کی بیداری اور اپنے فلسفے کی تشکیل پر صرف ہوئی۔ جوابِ شکوہ نے قوم کو مایوسی سے نکالا، جنگِ عظیم کے المیے نے ان کی فکر کو عالمگیر وسعت دی، اور اسرارِ خودی و رموزِ بے خودی نے وہ نظامِ فکر قائم کیا جس پر اقبال کی بعد کی تمام شاعری اور سیاسی رہنمائی کی عمارت کھڑی ہوئی۔ اس دور کی یہی دو فارسی کتب اقبال کو محض اردو کے شاعر سے بڑھا کر پورے عالمِ اسلام کے مفکر کے مقام پر فائز کرتی ہیں۔

سوال نمبر :4 سائمن کمیشن اور اقبال کا موقف 20) نمبر(

سوال نمبر :4 سائمن کمیشن کیا تھا اور اس بارے میں اقبال کیا موقف رکھتے تھے؟ تفصیل سے لکھیے۔(20)

تمہید و تعارف

سائمن کمیشن1927 ء میں برطانوی حکومت کی طرف سے ہندوستان کے آئینی مستقبل کا جائزہ لینے کے لیے تشکیل دیا گیا ایک شاہی کمیشن تھا، جس کے سربراہ سر جان سائمن تھے۔ اس کمیشن کو برصغیر کی سیاست میں ایک طوفان برپا کرنے والا واقعہ قرار دیا جاتا ہے، کیونکہ اس نے ہندوستانی قیادت کے اندر اختلافات کو بھی نمایاں کیا اور آئینی جدوجہد کو ایک نئے مرحلے میں داخل کر دیا۔ علامہ اقبال اس وقت پنجاب قانون ساز کونسل کے رکن تھے اور مسلمانوں کے ممتاز رہنما کے طور پر ان کا موقف اس کمیشن کے بارے میں پوری قوم کی توجہ کا مرکز بنا۔ ذیل میں پہلے کمیشن کا تعارف و پس منظر اور پھر اس کے بارے میں اقبال کے موقف کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

سائمن کمیشن کا پس منظر اور تشکیل

1919ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں یہ شق موجود تھی کہ دس سال بعد ایک کمیشن ہندوستان کی آئینی پیشرفت کا جائزہ لے کر آئندہ اصلاحات کی سفارشات پیش کرے گا۔ یہ جائزہ1929 ء میں ہونا تھا، مگر برطانیہ کی حکومت نے سیاسی وجوہات کی بنا پر مقررہ وقت سے پہلے ہی نومبر1927 ء میں کمیشن کا اعلان کر دیا۔ کمیشن کے سات کے سات ارکان انگریز تھے اور ان میں پارلیمنٹ کے اراکین شامل تھے؛ ایک بھی ہندوستانی اس کا رکن نہیں بنایا گیا۔ اسی" کل گورا " (All-White)ترکیب پر کانگریس، مسلم لیگ) جناح گروپ (اور دیگر جماعتوں نے شدید احتجاج کیا اور اسے ہندوستانیوں کی اہانت قرار دیا۔ کمیشن فروری1928 ء میں ہندوستان پہنچا تو" سائمن واپس جاؤ "کے نعروں، ہڑتالوں اور سیاہ جھنڈوں سے اس کا استقبال ہوا، اور لاہور میں اسی احتجاج کے دوران لالہ لاجپت رائے پولیس لاٹھی چارج سے زخمی ہوئے اور بعد میں چل بسے۔

مسلم لیگ اس مسئلے پر دو دھڑوں میں بٹ گئی۔ ایک دھڑا قائدِ اعظم کی قیادت میں کمیشن کے بائیکاٹ کے حق میں تھا، جبکہ سر محمد شفیع کی قیادت والا دھڑا کمیشن سے تعاون کا حامی تھا۔ شفیع لیگ کا استدلال یہ تھا کہ بائیکاٹ سے مسلمان اپنا مقدمہ پیش کرنے کے موقع سے محروم رہ جائیں گے اور میدان مخالفین کے لیے خالی چھوٹ جائے گا۔ اقبال کا شمار موقف کے اعتبار سے اسی دوسرے دھڑے میں ہوتا تھا اور وہ آل انڈیا مسلم لیگ) شفیع گروپ (کے سیکرٹری کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ کمیشن نے اپنی رپورٹ1930 ء میں پیش کی، جو نہرو رپورٹ1928) ء (کے متوازی ایک اہم آئینی دستاویز ثابت ہوئی اور بعد کی گول میز کانفرنسوں کی بنیاد بنی۔

اقبال کا موقف :بائیکاٹ کے بجائے مقدمہ پیش کرنا

اقبال کا موقف اصولی اور عملی دونوں پہلوؤں پر مبنی تھا۔ اصولی طور پر وہ بھی یہ مانتے تھے کہ کمیشن میں ہندوستانیوں کی عدم موجودگی ایک زیادتی ہے، مگر ان کی رائے میں اس کا جواب میدان چھوڑ کر نہیں بلکہ مسلمانوں کے مطالبات کو اتنی قوت سے پیش کر کے دیا جانا چاہیے کہ کمیشن اور برطانوی رائے عامہ مسلمانوں کے جائز حقوق کو نظرانداز نہ کر سکیں۔ اقبال مسلمانوں کی سیاسی حیثیت کے تحفظ کو سب سے مقدم سمجھتے تھے۔ انہیں خدشہ تھا کہ اگر مسلمان بائیکاٹ کریں گے تو کانگریس یا ہندو اکثریت کی نمائندگی کرنے والی آوازیں کمیشن کے سامنے مسلمانوں کے مستقبل کا فیصلہ بھی کر لیں گی، اور جدہ انتخاب (Separate Electorates) جیسی بنیادی ضمانتیں خطرے میں پڑ جائیں گی۔

عملی سیاست میں اقبال پنجاب قانون ساز کونسل کے رکن کی حیثیت سے مسلمانوں کے مفادات کی نگرانی کر رہے تھے۔ ان کی حکمت عملی یہ تھی کہ تعاون کو مشروط اور وقار کے ساتھ کیا جائے، یعنی کمیشن کے سامنے مسلمانوں کا متفقہ و منظم مقدمہ پیش کیا جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے مسلم لیگ کے اجلاسوں اور بیانات کے ذریعے یہ مطالبات واضح کیے: مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب برقرار رکھا جائے؛ صوبوں کو وسیع خودمختاری دی جائے تاکہ مسلم اکثریتی صوبے اپنے معاملات خود چلا سکیں؛ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے علیحدہ صوبہ بنایا جائے؛ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں بھی دیگر صوبوں جیسی اصلاحات نافذ کی جائیں؛ مرکزی قانون ساز ادارے میں مسلمانوں کو ایک تہائی نمائندگی دی جائے؛ اور پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کو آئینی طور پر محفوظ رکھا جائے۔ یہی مطالبات بعد میں قائدِ اعظم کے چودہ نکات(1929) ء اور پھر تحریکِ پاکستان کے آئینی پروگرام کی بنیاد بنے۔

اقبال کے موقف کا تنقیدی جائزہ

اقبال کے موقف پر ان کے مخالفین نے تنقید بھی کی اور انہیں حکومت کا تعاون کار قرار دینے کی کوشش کی، مگر یہ تنقید تاریخی حقائق کی روشنی میں درست نہیں۔ اقبال کا تعاون ذاتی مفاد کے لیے نہیں تھا؛ انہوں نے نہ کوئی عہدہ قبول کیا اور نہ حکومتی مراعات کی طلب کی۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ آئینی فیصلوں کے اس نازک مرحلے میں مسلمان کہیں پیچھے نہ رہ جائیں۔ ان کی دور اندیشی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جن آئینی ضمانتوں کا مطالبہ انہوں نے1927 ء تا 1928ء میں کیا، وہی اگلے بیس برس کی مسلم سیاست کا محور رہیں اور بالآخر الگ وطن کے مطالبے پر منتج ہوئیں۔ خود

قائدِ اعظم نے بھی بعد میں عملی سیاست کی نزاکتوں کو سامنے رکھتے ہوئے آئینی جدوجہد کا راستہ اختیار کیا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کا موقف جذباتیت سے بالاتر ایک حقیقت پسندانہ حکمت عملی تھا۔

خلاصہ و نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ سائمن کمیشن آئینی اصلاحات کے لیے بنایا گیا ایک کل انگریز کمیشن تھا جس کا عام ہندوستانی حلقوں نے بائیکاٹ کیا، مگر اقبال کا موقف یہ تھا کہ مسلمانوں کو جذبات میں بہہ کر اپنا مقدمہ کھونا نہیں چاہیے بلکہ کمیشن کے سامنے اپنے آئینی حقوق — جداگانہ انتخاب، صوبائی خودمختاری، سندھ کی علیحدگی، سرحد و بلوچستان میں اصلاحات اور مرکزی نمائندگی — کا بھرپور مطالبہ کرنا چاہیے۔ اقبال کا یہ موقف ان کی اسی بنیادی سوچ کا اظہار تھا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور ہندوستان کے کسی بھی آئینی انتظام میں ان کی جداگانہ سیاسی حیثیت کی ضمانت ناگزیر ہے۔ یہی سوچ تین سال بعد خطبہ الہ آباد میں اپنے منطقی انجام تک پہنچی۔

سوال نمبر :5 یورپ میں اقبال کی مقبولیت 20) نمبر(

سوال نمبر :5 یورپ میں اقبال کی مقبولیت پر مضمون تحریر کریں۔(20)

تمہید و تعارف

علامہ اقبال مشرق کے ان چند مفکرین میں سے ہیں جنہیں یورپ کے علمی و ادبی حلقوں نے ان کی زندگی ہی میں غیر معمولی عزت و مقبولیت عطا کی۔ یہ مقبولیت کسی وقتی شہرت کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ اس کے پیچھے اقبال کی ہمہ گیر علمی شخصیت تھی :وہ فلسفی بھی تھے، شاعر بھی، قانون دان بھی اور مشرق و مغرب دونوں تہذیبوں کے گہرے شناسا بھی۔1905 ء سے1908 ء تک کے یورپی قیام نے ان کے لیے مغرب سے براہِ راست مکالمے کی راہ ہموار کی اور وطن واپسی کے بعد بھی ان کا فکری رشتہ یورپ سے قائم رہا۔ ذیل میں ان اسباب و مظاہر کا جائزہ لیا جاتا ہے جنہوں نے اقبال کو یورپ میں مقبول بنایا۔

تعلیمی قیام اور علمی امتیاز

اقبال کی یورپی مقبولیت کی بنیاد ان کے تعلیمی قیام میں پڑی۔ کیمبرج کے ٹرنٹی کالج میں انہوں نے مشہور فلسفیوں کی شاگردی اختیار کی اور مغربی فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا۔ ان کی انگریزی زبان و ادب پر مہارت اور فلسفیانہ مباحث میں

شرکت نے اساتذہ و ساتھیوں کو ان کی ذہانت کا قائل کر دیا۔ اسی طرح میونخ یونیورسٹی میں ان کا پی ایچ ڈی مقالہ The Development of Metaphysics in Persia جب 1908ء میں لندن سے شائع ہوا تو یورپی مستشرقین نے اسے ایرانی فکر کے مطالعے میں ایک اہم اضافہ قرار دیا۔ جرمن علمی رسائل میں اس کتاب پر تبصرے شائع ہوئے اور اقبال کا نام یورپ کے مستشرقین کی فہرست میں شامل ہو گیا۔ ایک مشرقی طالب علم کے لیے اس دور میں یہ مقام حاصل کرنا غیر معمولی بات تھی۔

یورپ میں قیام کے دوران اقبال نے لندن کے علمی و سماجی حلقوں میں بھی نمایاں جگہ بنائی۔ انہوں نے مختلف مواقع پر اسلام اور مشرق کے موضوعات پر لیکچر دیے اور مباحثوں میں حصہ لیا۔ ان کی شخصیت کا وقار، گفتگو کی شائستگی اور انگریزی پر کامل عبور نے مغربی سامعین کو متاثر کیا۔ یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ اقبال مغرب سے مرعوب ہونے کے بجائے اس سے برابر کی سطح پر مکالمہ کرتے تھے؛ ان کی یہ خودداری یورپی اہلِ علم کو خاص طور پر پسند آئی، کیونکہ وہ ایک ایسے مشرقی مفکر سے مل رہے تھے جو تقلید نہیں، تنقید و تجزیے کی زبان میں بات کرتا تھا۔

تراجمِ کلام اور مستشرقین کی توجہ

اقبال کی یورپی مقبولیت کا سب سے بڑا ظہور ان کے کلام کے یورپی زبانوں میں تراجم ہیں۔ پروفیسر رینالڈ اے نکلسن، جو فارسی ادب کے مایہ ناز محقق تھے، نے اسرارِ خودی کا انگریزی ترجمہ The Secrets of the Self (1920ء) شائع کیا۔ نکلسن نے اپنے تفصیلی دیباچے میں اقبال کو جدید دور کا عظیم فلسفی شاعر قرار دیا اور ان کے فلسفہ خودی کو رومی کی روایت کا تسلسل بتایا۔ اس ترجمے کے بعد اقبال کا نام برطانیہ اور براعظم یورپ کے فلسفیانہ حلقوں میں گونجنے لگا۔ جرمنی میں اقبال کی شاعری کے تراجم شائع ہوئے اور جرمن مستشرقین نے انہیں مشرق کی بیداری کی آواز قرار دیا۔ بعد کے ادوار میں این میری شمل جیسی جرمن محققہ نے اقبال پر وقیع کتابیں لکھیں، جن میں Gabriel’s Wing نمایاں ہے، اور اقبال شناسی کو یورپی جامعات میں باقاعدہ موضوع بنایا۔

اقبال کے انگریزی خطبات The Reconstruction of Religious Thought in Islam نے ان کی شہرت کو اور وسعت دی۔ یہ خطبات جب 1930ء میں لاہور اور 1934ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے شائع ہوئے تو یورپ کے الٰہیاتی و فلسفیانہ حلقوں میں ان پر سنجیدہ بحث شروع ہوئی۔ اقبال نے ان خطبات میں سائنس کے جدید انکشافات کی روشنی میں دینی فکر کی تشکیلِ نو کی جو جرات مندانہ کوشش کی، اس کی نظیر اس زمانے میں یورپ کے مذہبی مفکرین کے ہاں

بھی کم ملتی تھی۔ اس کتاب نے اقبال کو محض شاعر کے بجائے ایک باقاعدہ مفکر و فلسفی کے طور پر یورپ سے متعارف کرایا۔

بعد کے ادوار میں اثرات و اعتراف

اقبال کی یورپی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انہیں عمر کے آخری حصے میں گول میز کانفرنسوں 1931)ء و1932 ء (کے لیے لندن جانا ہوا تو وہاں کے علمی حلقوں نے ان کا خیرمقدم کیا اور انہوں نے لندن و کیمبرج میں خطبات بھی دیے۔ یورپ کے اخبارات و رسائل میں ان کی شخصیت پر مضامین شائع ہوتے رہے۔ ان کی وفات1938) ء (پر یورپی پریس نے انہیں مشرق کے عظیم ترین شاعر و مفکر کے طور پر خراجِ عقیدت پیش کیا۔ آج بھی یورپ کی جامعات میں اقبالیات مطالعے کا باقاعدہ شعبہ موجود ہے، کیمبرج اور میونخ سے اقبال کے علمی رشتے کو اعزاز سمجھا جاتا ہے، اور ان کے کلام کے تراجم انگریزی، جرمن، فرانسیسی، اطالوی اور دیگر زبانوں میں موجود ہیں۔

تاہم اس مقبولیت کے ساتھ ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ اقبال نے یورپ کی مقبولیت کو کبھی اپنے مقصد سے اوپر نہیں رکھا۔ انہوں نے مغرب کی اچھائیوں کو تسلیم کیا، مگر اس کی مادیت پرستی، سرمایہ دارانہ استحصال اور روحانی خلا پر بے باک تنقید بھی کی، اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہی بے باکی یورپ کے سنجیدہ فکر حلقوں میں ان کے وقار کی وجہ بنی۔ وہ جانتے تھے کہ مغرب خود اپنے سوالات کے جواب تلاش کر رہا ہے، اور اقبال کے کلام میں اسے خودی، عشق اور مقصدِ حیات کے وہ جوابات دکھائی دیے جن سے جدید انسان محروم ہو چکا تھا۔ یوں اقبال کی یورپی مقبولیت دراصل مشرق و مغرب کے درمیان ایک فکری پل کی حیثیت رکھتی ہے۔

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ یورپ میں اقبال کی مقبولیت ان کے علمی امتیاز، فلسفیانہ گہرائی، کلام کے تراجم اور خطبات کی عالمگیر اپیل کا مجموعی نتیجہ تھی۔ کیمبرج و میونخ کی تعلیم نے بنیاد رکھی، نکلسن کے ترجمے نے اسرارِ خودی کو یورپ کے دروازوں تک پہنچایا، جرمن مستشرقین نے ان کے پیغام کو آگے بڑھایا، اور انگریزی خطبات نے انہیں دنیا کے بڑے مفکرین کی صف میں کھڑا کر دیا۔ یہ مقبولیت اس بات کی دلیل ہے کہ اقبال کا پیغام کسی ایک قوم یا خطے کے لیے نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے تھا، اور وہ مشرق کی طرف سے مغرب کو دیا جانے والا سب سے باوقار فکری جواب تھے۔